

خواہشوں کی تتلیاں

راست کا پچھلا پہر تھا یا نیچے کی جانب کھلنے والی کمڑکی میں چاند بالکل درمیان میں آ رہا تھا۔ یوں جیسے دو ہاتھ بڑھاتی تو اس کی ہتھیلی پر آ نکلتا۔ اسے چاند تاروں کی خواہش نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل تھا۔ زیور کپڑوں سے بنی یوں بھرا تھا کہ الماریاں نت نئی چیزوں سے بھری پڑی تھیں۔ اور وہ بیواؤں کا روپ و حارے بھرا کرتی۔ دیوانوں کی سی باتیں کیا کرتی۔ محوئے پھر نے کے سارے شوق کب کے ہوا ہو چکے تھے۔ بھری خوبصورت دنیا اس کے لئے پیسے راستے میں پڑنے والا بازار بن گئی تھی۔ ایسا بازار جس کی دکانیں اور ان میں بیچی اشیاء آنکھ کی تپکی کا نقش بن چکی ہوں۔ جن کی جانب دیکھنے کو اب من نہ کرتا نہ وہاں سے کچھ خریدنے کی حاجت محسوس نہ ہوتی ہو کوئی شے دل لہجائی نہ ہو۔ جہاں سے چند روز جلد گزر جانے کی خواہش ہو۔ دنیا اس کے لئے ایسا ہی بازار تھی۔

رات کی رانی کی مہک سے لبریز ہوا کا مہو نکلا کرے میں آ گھسا۔

اس کے لبوں سے سسکی نکلی مٹی۔ کبھی یہ ہوا کتنی روح پرور لگا کرتی تھی کبھی یہ مہک تنہا کو جذباتوں سے مہکا دیا کرتی تھی۔ کبھی پورے چاند کا منظر کیسا سرد و غما کرتا تھا اور آہن ہر انہمی خوبصورت بات دیکھے دل کو مزید دکھی کیا کرتی تھی۔ آہن درد کا کچھ درمان نہ تھا۔ پورا چاند مٹتی ہوا ساتھ لینا من چاہا جیون۔ مٹتی کچھ بھی اس کے دل کو خوشی نہ بخشتا تھا۔ درد بڑھانے کو ایک چہیتا فخر وہی کافی ہوتا تھا۔ صبح ہی تو اماں کہہ رہی تھیں۔

”یہ تو آہن کا ورختہ تو بالکل ہی کام سے گیا۔ لوگوں کے درختوں سے بھر بھر پور آیا۔ اب اور اس کو دیکھو کیا مینے بچا کھڑا ہے۔ اب کی بار اس کو کون اتنی دوں دوسرا پورا لگواؤں گی۔“

اور بھابھی نے اسے میڑھیوں کے پاس کھڑا کیچہ کر مسکرا کر کہا تھا۔

”اماں اکہیں آپ کی بھٹی بھوکا سایہ تو نہیں پڑ گیا اس پر بھی؟“

آہ..... ایک جملہ ہی تھا، چند الفاظ ہی تھے مگر کسی قیامت پھاہوئی تھی اس کے دل و دماغ میں کہ آنسو پوری رات بہتے ہی رہے۔ سسکیاں سینے میں ٹھٹھکی رہیں، ہچکیاں گلے میں لٹکی رہیں۔

ہر چند کہ اماں نے اپنی بات پہلے کہی تھی اور قافرد بھابھی نے بعد میں مکر اسے نبھانے کیوں وہم سا پڑ گیا تھا۔ کہ بھابھی نے جملہ پہلے ادا کیا تھا اور اماں نے وہ دھمکی بعد میں دی تھی۔

”اب کی بار اسے کٹوا دیں دوں دوسرا پودا لگواؤں گی۔“

نبھانے اماں کا کیا مطلب تھا۔ نبھانے وہ آم کے درخت کی ہی بات کر رہی تھیں یا پھر..... یا پھر..... اس کا سر چکرانے لگا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے مرد کو اللہ نے چار کی اجازت دی ہے تو کوئی مصلحت ہی ہو گی نا۔“ اماں اکثر اسے اس پاس دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔

”بے چارہ، اشعر!“ قافرد بھابھی سناتیں۔ ”مرد اپنے بچے کو گود میں لے تو ذرا اس کا چہرہ دیکھا کر ڈکھی دیکھیں بے درد وشتی اشعر کے چہرے پر؟“

”ان کے ساتھ نبھانے کیا پر اہلم ہے؟“ شہ پارہ کہتی۔ ”ہم تو قسم سے منصوبہ بندی بھی کریں تو وہ بھی ناکام ہو جاتی ہے۔“

اس کے ساتھ کیا پر اہلم تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ آج سے چند سال قبل وہ اور اشعر اپنا مکمل میڈیکل چیک اپ کروا چکے تھے۔

اشعر ہر لحاظ سے صحت مند بولہا باپ بننے کے لائق تھا لیکن اس کے اندر وہ اعضا کی نمو پوری طرح نہ ہو پائی تھی۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

اس خبر نے اس کی آستی کے ہر تار کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ گونج اب تک اس کے خون میں رواں تھی۔

وہ کمرہ وہ میز وہ میز کے پیچھے بیٹھی وہ ڈاکٹر اس کے گلے میں ٹانگہ اٹھائے ہوئے اور

اس کا اس لئے ادا کیا گیا جملہ۔۔۔ ایک ایک شے اس کے جاننے پر نقش تھی۔
 ”آئی ایم ساری ٹو سے دیت۔۔۔ مگر حقیقت یہی ہے سزا شاعر۔۔۔ آپ کبھی ماں
 نہیں بن سکتیں۔“

”آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔“
 اس کے لبوں سے ایک کراہٹ نکلے۔ ڈر کر اس نے اشعر کی جانب دیکھا، وہ اسی لئے
 جاگ گیا تھا۔ تانیہ نے جلدی سے آنکھیں میچ کر کرکٹ بدل لی۔
 وہ نہیں چاہتی تھی کہ اشعر کی نیند خراب ہو اس سے زیادہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ
 اشعر کا دل خراب ہو اسے روتا پا کر وہ ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔
 ”تانیہ!“ اشعر کا ہاتھ اس کے کانہ سے پر آرکا۔ اس کی ہتھیلی میں نیند کی حدت
 تھی۔ وہ محبت بھری تپش اس کے سرد وجود کو سکون بخشنے لگی۔ آنسو پوری روائی کے ساتھ اس
 کی گردن پر لکیر بنانے لگے۔

اشعر نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔
 ”اوہ۔۔۔۔۔ مائی گھوڑا!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ”تانیہ۔۔۔ میری زندگی! کب سے
 روری ہو۔“ سارے اعتماد رکھو کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔
 اشعر نے اسے اٹھا کر اس کا سر شانے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔
 ”بہی یار۔۔۔ بہی کرو۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔“

وہ اٹھا اور درم فریج سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا۔
 ”خود بھی مر جاؤ گی اور مجھے بھی مار ڈالو گی تم۔۔۔ کیوں اتنی ظالم ہو۔۔۔ کیوں خود
 پر اتنا ظلم کرتی ہو۔ چارنگ رہے ہیں صبح سوئے والی ہے۔۔۔ اور تم رورور کر خود کو مٹانے
 میں لگی ہو۔“

”میں مٹ جانا چاہتی ہوں اشعر۔“ وہ زخمی لہجے میں بولی تھی۔ ”میرٹ ہونے
 سے کتنوں کا سکہ چین خطرے میں ہے۔“

”ان سب میں کہیں تم نے میرا نام تو شامل نہیں کیا؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔
 ”اب یہ ست کہہ دینا کہ تم تو ٹاپ آف دی لسٹ ہو۔ رات کے آخری پہر تم

لوئی بنکنے لگی ہو۔ یاد ہے جب اپنی شادی ہوئی تھی۔۔۔۔۔“
 ”اشعر پلےز۔۔۔“ اس نے سوچی سوچی آنکھوں سے التجا کی۔ ”میرا دل اب ان
 کھلونوں سے نہیں بہتا۔ بھول جاؤ ان سب باتوں کو مجھے مجھ سے وابستہ ہر شے کو۔۔۔۔۔ بھول
 جاؤ اشعر۔۔۔۔۔“

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں پھر کہتی ہوں اشعر۔۔۔۔۔“ باقی بات کہنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے
 دانتوں سے نچال ب دیا۔ وہ جب بھی یہ بات کہتی تھی اس کا رد عمل بڑا شدید ہوا کرتا تھا۔
 ”بولو۔۔۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔“ وہ چپتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔
 تانیہ نے سر جھکا لیا۔

”بولو تانی! کہہ دو جی تمہارے دل میں ہے پھر میں جانوں اور میرا دل۔“ وہ لب
 کاٹتا اسے ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا اور یہ بات اس نے کبھی اشعر کو نہیں بتائی تھی۔
 ”اشعر! وہ اسے محبت سے دیکھ کر بولی۔

”بولو۔“ اس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی۔
 ”اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔
 ”مجھے صرف دو راستے پسند ہے جس پر تم میرے ساتھ ہو اور میں اسی راستے پر چل
 رہا ہوں۔“

”یہ راستہ۔۔۔۔۔ پتھروں سے، کانٹوں سے، طعنوں سے، تشوؤں سے اٹا پڑا ہے
 اشعر!“ وہ سسکی۔ ”اور میں تجھے پاؤں اس پر خاور سے پر جانے کب سے چل رہی ہوں۔
 میری روح تک زخمی ہو چکی ہے۔“

”تمہیں اپنے ساتھ میری پر محروم نہیں ہے۔ تانی!“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 ڈال کر پوچھنے لگا۔ ”تم مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا کرتی ہو تمہیں میری خوشی عزیز نہیں ہے۔
 ذرا سی باتوں سے گھبرا کر مجھ سے جدا ہونے کی بات سوچ لیٹی ہو۔ ابھی محبت ہے
 تمہاری۔“

”مجھے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ اشعر!“ اس نے اشعر کا ہاتھ

تمام لیا۔" اور میں تمہاری خوشی کے لئے ہی کہتی ہوں۔۔۔ دوسری شادی کرلو۔"

اشعر نے ہاتھ چمڑا لیے۔

"بس کر ڈسو جاؤ۔"

"اشعر..... میں..... میں نہیں رہوں گی تمہارے پاس تمہارے بچے اپنے بچوں

کی طرح پالوں گی! ان سے اپنی جان سے زیادہ پیار کروں گی۔ ان کی ماں کو اپنی محبت سے

دیت لوں گی۔ اسے بہنوں کی طرح چاہوں گی۔ اشعر....."

"میں نے کہا تھا 'رات کے آخری پہر تم بہک جاتی ہو'۔ وہ اپنی جگہ پر لیٹے

ہوئے بولا۔" مجھے صبح آفس جانا ہے 'میں تمہاری اول نول مزید نہیں سن سکتا۔"

"اشعر! میری بات تو سنو۔"

"کیپ کو انٹ تائیہ!"

اس نے ہاتھ بڑا کر بتی بجھا دی۔



وہ اشعر کی خالہ زاد تھی۔ خدا نے جیسے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا

تھا۔ اس نے میٹرک کیا تھا جب مین رزلٹ والے دن نیزہ خالہ اس کے لئے چار جوزے

اور ایک خوبصورت انگوٹھی لے کر آ پہنچی تھی۔

تانیہ کے والدین تو شروع ہی سے اس رشتے کے حق میں تھے۔ اشاروں کنایوں

میں کئی مرتبہ یہ بات ہو چکی تھی پھر اشعر کی بولتی نکاہوں سے کتنی ہی مرتبہ خوشبو جیسے پیام بھیجے

تھے۔ تانیہ اس کے حال دل سے واقف بھی تھی اور خود شریک حامل بھی۔

خالہ کی پہنائی ہوئی انگوٹھی اشعر کے دل کی طرح چار سال اس کے وجود سے لپٹی

رہی۔ چار سال بعد وہ اپنا وجود اس کے نام لکھ کر اس کے من آئین میں خوشبو کی طرح

آ رہی۔

اشعر اپنے والدین کا سب سے الٹن سب سے خوب رو اور چھٹا بیٹا تھا۔ ہر چند کہ

اس سے بڑا بھائی اور بھی تھا اور چھوٹا بھائی بھی لیکن جو محبت اشعر کے حصے میں آئی تھی وہ کسی

اور کی قسمت میں کبھی نہ بنی۔ یہی محبت تانیہ نے بہو بن کر سنبھالی۔ اس سے پہلے ناخود بخود بھی

اس گھر میں موجود تھیں۔ دو بیٹیوں کی ماں ہونے کا تمتہ ہمہ وقت ان کے سینے پر سجا رہا تھا۔ بیٹانی پر بڑی بہو اور بڑے خاندان کی بیٹی ہونے کا فخر چمکتا تھا۔ پھر بھی جو استقبال گھر میں تانیہ کا ہوا اس سے ان کے غرور کا چراغ مدہم پڑ گیا۔

تانیہ کا جو ہر خاص اس کی خوش خلقی تھی۔ اس کی آواز میں کوئل کی سی سٹھاس اور سر تھا پھر وہ بولتی بھی بڑے دلکش انداز میں تھی۔ نرم و ملائم لہجے میں وہ جب دل موہ لینے والے الفاظ میں گفتگو کرتی تو چھوٹے بڑے اس کے گرد یہ ہو جاتے تھے۔

پھر حسن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ کمر سے نیچے آتے سیاہ ریشمی ہال اس کا خزانہ تھے۔ وہ ان کی جی جان سے حفاظت کرتی۔ سمجھو رے کی سی آنکھیں اور سنہری دمکتی رنگت۔ خدا نے اسے کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔

اشعر تو پہلے ہی اس کا دلوانہ تھا۔ اس کے مل جانے کے بعد تو وہ خود کو بھی بھول گیا۔ خالہ کی چیتا بھانجی تھی پھر بڑی بہو سے اتنے سالوں میں کئی اختلافات ہوئے تھے۔ انہوں نے جان بوجہ کہ بھی تانیہ کا پر زور استقبال کیا تھا۔

فاخرہ بھانجی نے پہلے دن سے ہی اس کے لئے جذبہ رقابت محسوس کیا تھا اور چند سالوں میں تو وہ اس کی روایتی حریف بن گئی تھیں چنانچہ امر کے لئے انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی جتی اور اپنی کزن شہ پارو کو بیاہ کر لے آئیں۔

تانیہ کو خاندانی سیاست سے مطلب نہ تھا۔ وہ اشعر کی محبت کو مضبوط اور جاوداں دہار میں خود کو ہر طرح سے محفوظ خیال کرتی تھیں۔ ساس سرور اور نند اس کے دلوانے تھے۔ اس کے قسیدے ہر جگہ پڑھا کرتے اس کی راجدھانی کو کسی حریف سے خطرہ نہ تھا۔

وہ خود میں مگن ہے پڑا خوش خوش رہا کرتی۔ تب ایک دن زندگی کی حسین پر سکون جمیل میں خوشی کے ان گنت کنول کے پھولوں کے درمیان اضطراب اور بے یقینی کا پہلا پتھر روایتی حریف کی جانب سے آیا تھا۔

”اماں... اماں“ اس مینے کی بارو کو تانیہ اور اشعر کی شادی کی تیسری سالگرہ ہے۔ ہے نا۔“ مٹر کے دانے نکالتی فاخرہ بھانجی قدرے ہلکے جھلکے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں۔“ اماں نے صاب لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ لوگ..... کہیں..... اب تک..... میرا مطلب ہے شہ پارہ کی پریکٹس کا تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔ اس کے بیاہ کو کل پانچ ہوئے ہیں یہ لوگ شاید اس المحن میں پڑنا نہیں چاہتے۔“

اماں نے لختہ بھر کو سوچا تھا۔ قدرے فاصلے پر کھدان کے پھول بدلتی تانیہ کے ہاتھ سے پڑ گئے تھے۔

”ہوتا ہے بڑا ایسا بھی۔“ پھر اماں بے نگہری سے بول پڑیں۔ ”کون سی عرس گزر گئی ہیں۔ پورے بیس کی بھی نہیں تھی تانیہ شادی کے وقت، بعض لڑکیاں زیادہ وقت لیتی ہیں۔“

ظاہرہ بچا بھی بد مزہ سی ہو کر خاموش ہو گئی تھیں لیکن تانیہ کے دل میں پہلی پھانس چھپی تھی۔ اسے بڑا درد محسوس ہوا۔ رات کو بیڈ روم کی تباہی میں اس نے اشعر سے پہلی بات یہ بتا رکھی۔

”اوہ.....“ وہ ہنس پھس کر دوہرا ہو گیا۔ ”ارے بھی سیرنی جیوٹی سی ننھی منی بیوی تو چپکے سے بڑی ہو گئی اور مجھے خیر بھی نہ ہوئی۔ ماں بچے کا شوق جی اے بے باں؟“

”اشعر..... پلیز....“ اسے اشعر کا ہنسنا اہمانہ لگا۔ وہ سسلے پر تنہا لگی سے گفتگو کرتا چاہتی تھی۔ میکے میں بھی امی اور بھائی کئی مرتبہ دبے لفظوں میں یہ ذکر کر چکے تھے۔

”کیا آپ کو بچے پسند نہیں؟“

اشعر جواب دینے کے بجائے اسے شریر نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ جینپ کر ٹکابانی ہوئی۔

”اشعر پلیز.....“ جی جی جی نظروں سے اس نے استعجاب کیا۔

”بچے تو مجھے مجھے بہت پسند ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”میرے بھتیجیوں سے پونچھو گھر میں سب سے زیادہ انہیں میں پیار کرتا ہوں۔“

”تو پھر..... ساری عمر بھتیجیوں سے پیار کرتے رہیں گے؟“ اس نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

”نہیں جی..... بھر بھر پیار کرنے کا وعدہ تو آپ سے ہے۔“ وہ ہنوز اسی موڈ میں تھا۔

تانیہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے سر پر دست مارا۔ وہ ہنسنے لگا۔ تانیہ کو بھی ہنسی آگئی۔
بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

لیکن بات اس وقت ان کے درمیان ہی آئی گئی ہوئی تھی۔ شہ پارہ کے ہاں
نصفی نگاہی کی گزریا کی آمد ہوئی تو عزیز، رشتہ دار، ہمسائے، دوست احباب سب ہی کے منہ کھل
گئے۔ جو بھی آتا وہ تانیہ پر ایک آدھ فقرہ چست کرتا اپنا فرض خیال کرتا۔ ہر طرف سے
تیروں کی بو چھاڑ ہوئی تو وہ پور پور چھل گئی۔

”اشعر..... مجھے لیزلی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ مجھے اپنا چیک اپ کروانا ہے۔“
اس کی ایک ہی منہ تھپی اور اشعر کو نجانے کیا وہ ام تھا وہ اسے بہا تار بتا۔
”چلیں گے یاداً“ کون سا بیماری عمریں زحل گئی ہیں اور پھر جن کے ہاں
اولاد دیر سے ہو ان میں بڑی اثر اسٹینڈنگ اور محبت ہوتی ہے۔

”وہ کیسے؟“ وہ پوچھ جاتی۔

”شادی کے فوراً بعد ہی جو عورتیں حاملہ ہو جائیں وہ شوہر کو مکمل محبت اور توجہ نہیں
دے پاتیں۔ ان کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ ہر چیز میں احتیاط شامل ہو جاتی ہے۔ گھوٹنے
پھرنے کا، سجنے سنورنے کا شوق مٹ پڑ جاتا ہے، شوہر الگ بد مزہ دوتا ہے پھر جب نووارد
وارد ہو جاتے ہیں تو پھر تو سمجھو شوہر بے چارے کا کام قیام۔ آفس سے تھکا ہارا آئے تو بیگم
بچہ تھما کر کچن میں غائب ہو جاتی ہے وہاں سے نکلتی ہے تو بچہ لے کر پھر کسی کمرے میں تائب
ہو جاتی ہے۔ یہ بے چارے حیران پریشان فی وی آن کر لیتے ہیں۔ صبح پتا چلتا ہے فی وی
دیکھتے دیکھتے کسی لمحے آنکھ لگ گئی تھی۔ بیگم نے چپکے سے فی وی بند کر کے سناٹے میں ڈال دیا
تھا۔“

تانیہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔ اشعر کی اوٹ پٹائی باتوں اور مستحکمہ خیر
تاثرات نے اسے تقریباً بھلا ہی دیا تھا کہ وہ کیا بات کر رہی تھی۔

پھر بوا یوں جو دن پر لگا کر بے نگری سے ازب جلیا کرتے تھے ان کے پردوں میں
اب پہلی سی تیزی اور تازگی نہ رہی۔ بے نشینی اور اضطراب کے جہانگ ازاتے چینیٹوں نے
دنوں کے پر بوجھل کر دیئے۔ شہ پارہ تین ماہ بعد پھر حاملہ ہو گئی۔ اس کی بیٹی بہت چھوٹی تھی

لیکن وہ بہت خوشی اور مطمئن تھی۔

”اگر کو بیٹا چاہئے۔ دیر کس بات کی؟ اچھا ہے ساتھ ساتھ پل جائیں گے۔“

وہ بیٹے کے لئے وظائف پڑھتی رہتی۔ یہ کہ ماں نے اولاد کی نجات سے سرفرازی کے وظائف دیئے تو اسے خوف سا محسوس ہوا۔ زندگی میں ایک بڑے فلاکے احساس ہوا سب کچھ ہوتے ہوئے کچھ بھی نہ ہونے کا احساس۔

وہ وظائف پڑھنے لگی۔ آس کی جوت بار بار بھٹی اور بار بار بھیجی جاتی۔ جس قدر شمع و خضوع سے رو پڑھا کرتی اتنی ہی گھٹنا نوپ مایوسی اسی گھیرتی چلی گئی۔

شہ پارہ نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تو وہ دیکھے میں منہ چھپا کر خوب روئی۔ اشعر ساری رات اسے دلا سے دیتا رہا۔ ساتھ بھانے کی قسمیں کھاتا رہا لیکن آنسو تھمنے کا نام نہ لیتے تھے اور نیند تھی کہ پکوں کی دلیز چھونے کو تیار نہ تھی۔

”میں نے بھی تو تھپنے پڑھے تھے اشعر۔! میں نے بھی تو دعائیں مانگی تھیں۔

نڈانے اس کی دعا قبول کی میری تمام اولاد دی۔“

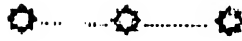
”تائیہ! خدا کسی کی دعا نہیں لوٹاتا۔ ہر بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے خواہ قبولیت کا انعام روز قیامت ہی کیوں نہ ملے۔ دیکھو تائیہ! دنیا میں بے شمار بے اولاد جوڑے ہیں! یہ آزمائش اللہ نے بہتوں کی رکھی ہے۔ لیکن یہ سوچو کہ اس آزمائش کا انعام بھی تو ہو گا اور اللہ کا انعام ہر نکت سے بلند اور بھاری ہے۔ تم اس انعام کا کیوں نہ سوچیں۔

”نہیں! اشعر! نہیں اللہ کا واسطہ یوں نہ کہو۔ یوں کہو کہ انشاء اللہ! اللہ ہمیں بھی اولاد دے گا۔ ہمیں بھی آزمائش میں نہیں ڈالے گا! ہمیں اپنی ہر نکت سے نوازے گا۔“

”خدا اگر تے ایسا ہی: دگر انسان کو بلند و بالا: چاہئے اور دوسروں سے مسابقت نی: بہت تنگ: دینے والی ہوتی ہے۔ اولاد ہو جائے تو بیٹوں کی درڑ بیٹے ہو جائیں تو ان کے مستقبل سی: درڑ: ہر وقت انسان اپنے نصیب سے حالت جنگ میں رہتا ہے تائیہ! اولاد دینے نہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اس کی اطاعت! اس کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ یوں دل کو چھوڑنا نہ کرو۔“

اشعر نے اس کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن فائزہ: بھابھی اور شہ پارہ کے

بٹے مسکراتے چہرے اس کے ذہن سے نہ نکلتے تھے۔



اور پھر اس نے اشعر کو میڈیکل چیک اپ کے لئے آمادہ کر رہی تھی۔

اور پھر ڈاکٹر نے اسے زندگی کی سب سے تلخ حقیقت بتائی تھی۔ جس نے اسے جینے کی خواہش سے ہی محروم کر دیا۔ کتنے دن کتنی راتیں وہ کمرے میں بند سب کی چیختی سوال کرتی نظروں سے دور بجلی میں منہ چھپائے پڑی رہی۔

اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ تاخرہ بھابھی کی طنزیہ نگاہوں اور تسخیرانہ مسکراہٹ کا سامنا کرتی۔ شہ پارہ کی غرور سے بھری پیال اور فخریہ جملوں سے اسے تنہائی میں بھی خوف محسوس ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سبھی خالہ کا بچھا ہوا چہرہ اور بھگی پٹکوں کا خیال اسے اندر سے کانٹے لگتا۔

وہ بیمار پڑ گئی۔ تمنا کی جلتی لوکیا بھئی تھی کہ وہ راکھ بن کر رہ گئی۔ دھجک تھلس گیا آنکھوں کے گرد سیاہ جلتوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ بال نوسنے مگرتے شاٹوں تک آپہنچے۔ وہ آپ اپنا مذاق بن گئی۔ ایسے میں اشعر اس کے کبھی دل کا مرہم تھا۔ وہ اس کا ہم روز ہم نفس قدم قدم پر اس کا ہاتھ تھا۔ رہا۔

”تانیہ! اللہ نے ہر انسان کو مکمل بنایا ہے۔ مجھے ’ضمہیں‘ ہم سب کو۔ کسی کا ہاتھ نہیں ہے، وہ بھی مکمل ہے۔ کسی کی ٹانگ نہیں ہے، وہ بھی مکمل ہے اس جسم ساز نے جب مٹی کے بے جان پیکٹ میں روح پھونکی تو سمجھو کہ اسے جسے کے مکمل ہو جانے کا یقین تھا۔ وہ جسم کو مکمل جانتا تو اس میں روح کیوں پھونکتا؟ اب مٹی کے اس جسمے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کو پہنچ کرے اور اسے بتائے کہ اس نے؟ تمام جسم بنایا ہے۔ اس کی تحقیق دینی چاہتا ہے۔ جن کے پاس اولاد ہے، وہ اس اولاد کے پیدا کرنے میں با اختیار نہ تھا۔ انہیں خدا کے خزانے سے دیا گیا جو اس نے دینا چاہا۔ اب اگر وہ ہموافرد و نر و جراثیم تو دن کا نر و خرو و انہی کے لئے چھوڑ دو خود پر خدائی مت کرو۔ تانیہ! تم اپنے آپ میں تلاش کرو کہ اللہ نے ان کی اس برتری کے جواب میں جنہیں کن کن چیزوں سے فوقیت دی ہے۔ یقیناً تمہیں بہت کچھ نظر آئے گا اور پھر تم اپنے رب کا شکر ادا کر دو گی۔“

اس نے اشعر کی باتوں پر توجہ دینا شروع کی تو طبیعت میں بہتری آنے لگی۔
 شادی سے پہلے اس نے پرائیویٹ جی اے کیا تھا۔ اب ریگولر ایم اے میں داخلہ لے لیا۔
 صبح سویرے جب وہ گھر سے اشعر کے ساتھ نکلتی تو ڈاڑھ بھابھی اور شہ پارہ کی
 دلی دلی مسکراہٹیں اس کا پیچھا کرتیں۔ وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے کسی کو دیکھا ہی نہ ہو۔
 کبھی ان کا کسا ہوا فقرہ کان میں پڑ جاتا۔

”ہائے۔۔۔ بے فکری کی زندگی! سچے نہ ہوں تو عورت خود ہی بچہ بن جاتی ہے۔“
 ”دلی دلی ہنسی تعاقب کرتی۔ اس کے کانوں میں سیسہ پڑتا۔ دل سے تیس اٹکتی۔“
 کبھی سانس کی آہ بھری سانس چھپا کرتی۔

”میرا اشعر۔۔۔۔۔“ وہ اکثر کہا کرتی۔ ”کیا خبر تھی۔۔۔۔۔“

تانیہ سب کچھ سن کر بہری ہو جاتی۔ گوتگی تو وہ ایک مدت ہوئی تین چکی تھی۔
 یونیورسٹی جا کر بھی چین نہ ملتا تھا۔ لڑکیاں لڑکے باتوں میں مٹی زندگی کے
 متعلق سوالات کرتے پھر دو کلاسن روم میں درس اور ہمدردی بھرے الفاظ سنی دیتی۔

ہاں نہ بن سکتا کیا اتنا بڑا جرم ہے؟ اس دوئے زمین پر عورت پر لگنے والا سب
 سے بڑا انحراف ہانچے پن! کیوں؟ اس میں عورت کی خلاقیت کیا؟ یہ تو اس خالق کا کام ہے جو
 عورت کو کھنکھاس ایک ذریعہ بناتا ہے۔ اگر اس کام کے لئے اللہ نے اسے نہیں چاہا تو وہ ممتوب
 کیوں؟

سوچ سوچ کر وہ بڑھ چلی ہو جاتی مگر دل میں جلتے والا کو فرق نہ پڑتا۔ وہ اس
 دائرہ سے بٹل جاتا۔

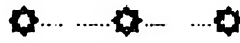
جب کوئی غم نہ تھا، وہ سوچتی نہ تھی، اب انکشاف کے نت نئے رنگ روز اتر
 کرتے۔ عورت کی دشمن عورت کا یہ بھیاں تک روپ اس کے تصور کی گرفت میں کبھی نہ آیا تھا۔
 مستنبر، تنقید، طنز، طعنے، تحقیر۔۔۔۔۔ اتنے تیر اپنی فطرت کے ترشٹ میں سینے ہوئے عورت بظاہر
 سختی صاف، اجلی اور معدوم ہے۔

کسی کو خبر نہ ہوتی اور اس کا دل پارہ پارہ کر دیا جاتا اور تیشہ محض ایک مسکراہٹ
 ہوتی۔ ایک تیکھی نظر لوگ خوش گویاں کرتے ہوئے کسی شوگر کوئٹے میں بھرا زہر اس کی

رگوں میں اتار دیتے۔ اس کے لبوں سے آدھک نہ نکلتی۔

اس کے سامنے بچوں کو لپٹا لپٹا کر چوما جاتا۔ ان کے مستعیش کی باتیں کی جاتیں۔
 "ماں" کی غفلت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا اور بانجھہ بچہ کے تصور سے بھی اللہ کی ہنسا مٹائی جاتی۔

دو لمحہ لمحہ گھلتی، قطرہ قطرہ پھلتی، روز مرنی، روز جیتی۔ وہ کسی کی شکایت کیسے کرتی؟
 کس کو اپنی حیات کا دشمن قرار دیتی؟ کس پر اپنے قتل کا انعام لگاتی؟ ٹوٹا ہوا دل نظر نہیں آتا؟
 اندر گرتے آسوا ہنسا سراغ نہیں دیتے، لمحہ لمحہ مرنے کی قاتل کا نام نہیں لیتی۔ ہر چند کہ قاتل نظروں کے سامنے ہی ہو۔ اس نے جانا تھا کہ جہنم کی دہلی آگ اکثر غوروں کا مقدر کیوں ہے۔



زور زور سے سسٹی ہوئی زندگی ایک مرتبہ پھر نکھری تھی۔

"ہائیہ!"

وہ ایم اے کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی، جب اماں نے اسے ایک کڑی آزمائش کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"ام کوگوں نے بہت سوچا ہے، سب گھر والوں نے رات دن بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیا ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے۔"

انہوں نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پر ڈالی پھر جی کڑا کر کے بولیں۔

"اشعری دوسری شادی کر دی جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس کے حواس کچھ دیر کو متزلزل ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، کان سائیں سائیں کرنے لگے۔
 انہیں کچھ جواب دینے کا دباؤ اپنے کمرے میں پہلی آئی۔ کنڈی چڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اشعر۔۔۔ اشعر کی دوسری شادی۔ اشعر اس کی آتی جاتی سانس تھا۔ سانس میں دو انسانوں میں پائی جاسکتی ہیں؟ اشعر اس کے سینے میں دھڑکتا دل ہے، اپنا آدھا دل کاٹ کر بھلا دے کیسے دے دیتی؟ اس کی ہر خوشی ہر مہکان اشعر سے شروع ہو کر اشعر پر ختم ہوتی تھی۔

اس کی خوشیاں اس کی سکرابوٹ اس سے طلب کر لی گئی تھیں۔
 وہ زندگی کے سب سے مشکل موڑ پر آکھڑی ہوئی تھی۔



وہ سب ڈرائیو میں بیٹھ گئے۔

اماں! اب جی ہنور بھائی! ناخبرہ بھابھی! امزشہ! پارہ! عالیہ! اور اس کا شوہر تمیل! تانیہ!

اور اشمر۔

اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب کوئی اہم فیصلہ زیر غور ہوتا۔

"بیٹے! اللہ نے بھی مرد کو چار غورتیں رکھنے کا اختیار دیا ہے۔ یہ اختیار بے وجہ نہیں دیا گیا اس کے پیچھے ہزار ہا مسلماتیں پوشیدہ ہیں۔" اباجی بولی رہے تھے۔ تانیہ ہلکیس ہلکیے ہنسا
 آنسو بھری نظروں سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی اباجی تھے جن کی کبھی وہ لاڈلی بہو ہوا
 کرتی تھیں۔ اس کی جگہ اگر عالیہ ہوتی تو تانہ نے اباجی! تمیل! بھائی سے یہ سب کچھ کہتے یا
 نہیں۔

"نسل بڑھانا ہر آدمی کی خواہش ہے اس خواہش کو خدا نے مرا کے دلی میں
 پہنچا دیا ہے۔ بقی ہڈیوں کی خاطر اپنی بڑی خواہش کی قربانی دے بھی دے تو بعد میں
 پچھتاوے ہی اس کا مقدر نہیں رہتا۔ میں اور پھر سب جانتے ہیں تانیہ سے تمہیں محبت ہے۔ ہم
 جن تادیہ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ تو ہمارا حق ہے کہ جواباً تانیہ بھی ہمیں چاہے ہمارا
 خواہش ہے کہ سچے تمہیں خوشی دوسری شادی کی ایمان دے۔ یہ کوئی گناہ نہیں خدا کا عطا
 کردہ حق ہے۔ اس ان کا وارث ضرور ہونا چاہئے جو اس کے نام کو آگے بڑھائے۔ پہلا تانیہ
 ہم اس کا حق میں ہے اس کوئی شکایت نہ ہوگی۔ بلو اشمر بیٹے! تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"
 اشمر۔۔۔ جیسے جیسے سر کو اٹھا کر پہلی مرتبہ ان سب کے چہروں کو بڑی پارسی
 دیکھا۔ وہ صاف لپا چمک رہا۔

"اباجی! وہ بی شادی مرد کا اختیار ہے اس کا حق ہے لیکن مرد پر فرض نہیں ہے۔
 اس نے لئے آیت آجی ہے پاپا ہے تو اپنے لئے چاہے تو چھوڑ دے لیکن اس کی اپنی خواہش
 اس کی خواہش صرف تانیہ ہے۔" تانیہ کے رکنے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس

نے سر جھکا لیا۔

”دوسری بات یہ کہ نسل بہت سے لوگوں سے قائم و دائم ہے۔ آپ کا نام آپ کے تین بیٹوں کو ملا اس سے آگے انور بھائی کے دو بیٹوں اور ہمر کے دو بیٹوں سے انشاء اللہ چلتا رہے گا۔ یعنی آپ کے نام کی نسل کو ایک میرے دوسری شادی نہ کرنے سے کوئی خطرہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ آیا میں اپنا نام آگے بڑھانا چاہتا ہوں یا نہیں؟ تو میرا جواب ہے میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں۔ ہر انسان کو مر کر فنا ہونا ہے، مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ اعمال کا سلسلہ دیں رک جاتا ہے تو نام دنیا میں چلے یا نہ چلے اس بات سے کم از کم مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے دادا پڑدادا کا نام مجھ سے چل رہا ہے لیکن میں انہیں نہیں جانتا صرف ان کے نام سے واقف ہوں جیسے میں اور بہت سے گزرے ہوئے لوگوں کے نام سے واقف ہوں تو پھر ان کی امداد کو مجھ سے کیا حاصل ہے؟ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا غرض؟ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور ہمارے ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اس فانی دنیا میں ایک دن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا میں ضروری نہیں سمجھتا کہ میری اولاد ضروری ہو۔ اپنے بچے بچوں کو میں اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں، میری روح کی پیاس مٹ جاتی ہے۔ جس نسل کی طلب تم نہیں ہوتی وہ تانیہ کی محبت ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہتا اور میرا خیال ہے اس بحث کو آج یہیں ختم بھی ہو جانا چاہئے۔ چیزوں کی تکرار مجھے پسند نہیں۔“ دو آنٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چلو تانیہ! مجھے نیند آرہی ہے۔“

کمرے میں آ کر وہ اس کے قدسوں سے لپٹ گئی تھی۔

”اشعر۔۔۔ اشعر۔۔۔ اشعر۔۔۔“ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے تکرار پسند نہیں، دو

ایک ہی نام کی تکرار کئے جا رہی تھی۔

اس کا بس نہ چلتا تھا، وہ خود کو اس پر سے واردے۔ خوشبو بن کر اس کے وجود

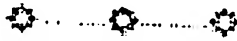
میں سا جائے۔

”تانیہ! تم سے بھی مجھے ایک بات کہنی ہے۔“

اشعر نے اسے اٹھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

”اللہ نے انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا! اپنی مرضی کی خواہشاتیں دیں! اپنی مرضی کی مروتیاں بخشیں پھر انسان کی مرضی بنائی کہ وہ اللہ کی مرضی میں خوش ہے یا ناخوش۔ دونوں اختیار انسان کو بخش دیئے! اس لئے انسان اگر خود چاہے تو کوئی محرومی نہیں۔ کوئی ناخوشی! ناخوشی نہیں! اس لئے اللہ کی رضا میں خوش رہو گی تو کوئی تمہیں ناخوش نہیں کر سکتا اور لوگوں کی خواہشات پوری کرتے چاہو گی تو کوئی تمہیں خوش نہیں کر سکے گا! سمجھیں۔“

اس نے دوتے دوتے مسکرانے کی کوشش کی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اشعر نے ہولے سے اس کے کال پر جیت لگا لی تھی۔



کچھ عرصہ اور بیٹا تانیہ کے رستے نامور کا منہ کچھ عرصے کے لئے بند ہوا تھا کہ شہ پارہ نے ایک اور بچی کو جنم دے کر گھر کی خاموش فضا میں کنکر پھینک دیا اور تو اور کا خرہ بجا بھی گئی رپورٹ بھی پائیو آگئی۔

مرد ہوتا الاؤ ایک بار پھر دھک اٹھا۔

”شہ پارہ!“ بچی کے لئے لائے گئے کنکس اسے دیتے ہوئے نبجانے تانیہ کو کیا سوجھی تھی۔ ”شہ پارہ! ہم ایک ہی کمر میں رہتے ہیں! تم اسے مجھے پالنے دو اسے مجھے دے دو پلیز۔“ شہ پارہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ تانیہ کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

”اسے دودھ پالو گی! اماں بولی تھیں۔“

تانیہ کا سر ہلک گیا۔

”دو دودھ شہ پارہ پائے اور بچی کو تم سنبھالو تو تم اماں نہیں آیا ہو گی۔“

تانیہ کو ایسا کجا! اماں نے اسے کسی پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو اور وہ مگر تلی چلی جا رہی ہو۔

”دوسرے کا بچہ سنبھالنے سے وہ اپنا نہیں بنی جاوے تانیہ!“ اماں اس سے سخت نفرا تھیں۔ اس نے ان کا سب سے قیمتی سب سے پیارا بیٹا اپنا بیٹا لیا تھا۔

”اور پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہو تو سب بچوں کو اپنا بنانا کر پنا کر دے! یہ تقسیم کیسی“

”اں اگر واقعی ماں بننا چاہتی ہو تو اشعر سے کہو! دوسری شادی کر لے۔ اشعر کا بچہ واقعہ تبارا

خوش تھا۔ انہوں نے بہت پر تکلف کھانا کھایا تھا۔ سائل پر گھوڑے تھے لائیک ڈرائیو کو انجوائے کیا تھا اور خوش خوش واپس لوٹے تھے۔

”آج کا دن انجوائے کیا؟ سونے سے قبل وہ اس سے پوچھنے لگا۔

”ہاں، مگر ایک چیز رہ گئی۔“

”اوہ... رینٹی؟ وہ کیا؟“

”میرا گنٹ! تم نے مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔“

”آر یو سیریس؟“ وہ ہنسا۔ ”تم نے تو برسوں سے کسی چیز کا نام نہیں لیا۔ یہ آج

مجھے کا خیال کیسے آگیا۔ کہو کیا چاہتے؟“

”سوکن۔“ وہ قلعہ بنجید دھکی۔

”واٹ؟“ یہ کیا مذاق ہے؟“

”نہیں، حقیقت ہے۔ تمہیں اب دوسری شادی کرنی ہو گی! اشعر.....! کیونکہ یہ

میری واحد خوشی ہے۔ اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو۔“ وہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”سمجھو میں تمہیں خوش نہیں دیکھنا چاہتا۔“ تاہم اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی بھر

ان نے اپنی بند منجھی کھولی۔

”پھر میں موت کو ترجیح دوں گی۔“ اس کی ہتھیلی پر نیند کی گولیوں سے بھری شیشی

تھیں۔

”تاہم!“ اشعر نے اس کے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ مارا پھر اسے خود سے لپٹا

یا۔

مب کے لئے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ اشعر نے دوسری شادی کے لئے ہاں

کہہ دی تھی۔ اب جی اور اماں کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے تھے۔ ناغہ اور شہ پارہ کی

نکمر میں چمک آگئی تھی۔ انور، بھائی اور امیر ملین ہو گئے تھے اور تاہم کو ایک ناقابل فہم

ذہنیت کا سامنا تھا۔ اماں نے اسے چند لمحہ دیر میں دیں۔

”اشعر کو دکھا دو۔ یہ لڑکیاں اچھے شریف گھرانوں کی ہیں۔ ان کے والدین

دینی شاہنشاہی کے خواہش مند مرد کو دینے پر رضامند ہیں۔ اشعر سے کہو اپنی پسند تھا دے۔“

تانیہ نے لٹافے میں سے تصویریں نکالیں۔ ایک کے بعد ایک دیکھتی رہی پھر سب تصویریں رکھ کر لٹافہ اس کو واپس کر دیا۔

”ان میں کوئی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“ اماں حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”اشعر کے ساتھ چنے گی کوئی؟“ وہ التا انہی سے پوچھنے لگی۔ ”اشعر کی دلہن! اشعر کی نہیں! میری پسند سے آئے گی اور میں اشعر کے لئے چاند تک توڑ لانے کی تیار رہتی ہوں۔“

”بوجہ! سوکن پسند کرو گی۔ اتنا بڑا دل ہوا ہے کسی عورت کا آج تک۔ ہر لڑکی رچیکرتی جاؤ گی کہ اسی بہانے وقت گزار رہے ہیں۔“

وہ بڑا بڑا بڑے چلی گئیں۔ اس کے لبوں پر وہی ناقابل فہم مسکراہٹ تھی۔

”اشعر کے لئے اشعر بھتی و تھی لڑکی ہونی چاہئے۔ دس برس پہلے وہ چھبیس سال کی عمر میں دلہا بنا تھا۔ ابھی محض چونتیس برس کا ہے۔ وقت اسے چھو کر نہیں گزرا۔ کیا کمی ہے اس میں جو اسے اچھی دلہن نہ ملے گی۔ میں اس کے لئے حوروں جیسی دلہن لاؤں گی تاکہ بچے خوبصورت ہوں۔ میں انہیں خوب پیار کروں گی وہ اپنی ماں سے زیادہ میری محبت کو مانیں گے اور اشعر..... اشعر جانے گا کہ اس کی تانیہ کا دل کتنا بڑا ہے میرا اشعر ہمیشہ میرا رہے گا۔“



وقت گزرتا رہا اسے کوئی لڑکی پسند نہ آتی تھی۔ ہر کسی میں وہ کوئی خامی دھونڈ لیتی۔ اشعر نہ اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا۔ سب گھر والوں نے اس کو ڈرامہ بازی کا نام دیا۔ تانیہ کو کھنی اور مکار کے القابات سے قنوارا گیا۔ وہ سنی ان سنی کرتی گئی۔

ایک روز وہ کتابوں کی دکان پر کھڑی دینا پسندیدہ ماہنامہ لے رہی تھی۔ جب اس لڑکی پر نظر پڑی۔ تانیہ چند لمحوں کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ دس سال پہلے والی تانیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی شہدِ رقت، وہی سیاہ کمبورا آنکھیں، وہی دلکش مسکراہٹ، وہی کمال میں پڑا گزرا۔

دوسرے ہتھ بھول کر اس کی سمت بڑھ گئی۔
 ”ایکسکوز می۔ میرا نام تانیہ ہے۔ آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے یا نہیں آ رہا۔ آپ
 کا نام جان سکتی ہوں؟“
 ”قدیل!“ وہ مسکرا دی۔ ہر طرف جگمگاہٹ سی پھیل گئی۔
 ”کہاں رہتی ہیں؟“

وہ بڑی سادی لڑکی تھی جو اب اپنا پتا تفصیل سے بتا دیا۔
 ”ایک بات کہوں اگر آپ پرمانہ مانیں۔ اگر آپ مجھے اپنا نمونہ نمبر دے دیں تو
 پلیز۔“ قدیل کی نگاہوں میں چمک سی اچھری۔ لڑکیاں ایسی باتوں کا مطلب خود ہی سمجھ
 جاتی ہیں اس نے اپنا نمبر ایک چھوٹے سے کانڈ پر لکھ کر اسے تھما دیا۔ وہ خود بھی تانیہ کے
 پیرے مہرے اور لباس وغیرہ سے کافی مرعوب نظر آتی تھی۔
 تانیہ وہ چھوٹا سا کانڈ سٹھی میں دبائے دکان سے نکل آئی۔ دوسرے مدد خوش نظر آتی
 تھی۔



قدیل ایک جیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ غریب ہوئے انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنی
 بیوی خالہ کے پاس رہتی تھی جو سلائی کر کے اپنا اور اس کا بوجھ اٹھاتی تھیں۔
 خورید جوان اور اچھی پوسٹ پر فائز اشعر کا رشتہ انہیں ایک نعمت غیر مترقبہ کی مانند
 لگا بیسے خالہ بھانجی کے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہیں تانیہ کے ہونے نہ ہونے سے غرض نہ تھی۔
 قدیل کو اس کے ساتھ ایک گھر میں رہنے پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ یہ رشتہ فوری طور پر منظور کر
 لیا گیا۔

تانیہ بہت خوش تھی۔ اس نے اشعر کے لئے بہترین انتخاب کیا تھا۔ ”قدیل سے
 اچھی لڑکی بھلا مل سکتی تھی اس کو۔ چاہے کنوؤں میں ہاں ڈالو اتنی چہرے لے کر پھرتیں۔
 اشعر کے دل میں میری قدر و منزلت کس قدر بڑھ جائے گی جب وہ قدیل کو دیکھے گا۔ اس
 کے ساتھ بہت گزارے گا تو میرا خیال اپنی پل اس کے ساتھ رہے گا۔“
 وہ شادی کی فریادیں کرنے لگی۔

”تانیہ!“ اشعر کی آواز پر اس کی سسکی نکل گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس شخص سے آنسو چھپانے کی اب کچھ خاص ضرورت نہ تھی۔

”روری، تانیہ! یہ تو تم نے اپنی خوشی کی قیمت رکھی تھی پھر یہ آنسو؟“
 ”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں اشعر!“ اس نے سکرانے کی کوشش کی۔ ”تمہارا گھر پھر
 نئے سرے سے بس رہا ہے۔ کچھ ہی عرصے بعد تم باپ ہو گے..... میں..... سوتیلی ہی
 سہی..... ماں کہلاؤں گی۔“

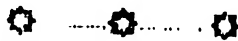
”تم تیار نہیں ہو تمیں تانیہ!“ وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ ”میری
 بات لے کر نہیں چلو گی۔ تمہیں تو اسی موقع پر آگے آگے ہونا چاہئے۔ تانیہ!“
 تانیہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ بلیک سوٹ
 میں میردن ٹائی اور جیب میں سچے میردن رومال کے ساتھ وہ حد درجہ دھیرہ لگ رہا تھا۔ سیاہ
 خاموش آنکھیں اسے دیکھنے جا رہی تھیں۔

”اشعر.....“ وہ بے اختیار ہو کر اس کے سینے سے جا لگی۔ ”اشعر..... خدا کے
 لئے تم تو میرا مذاق مت اڑاؤ۔ اہا! یہ قربانی میں نے اپنی مرضی سے دی ہے۔ لیکن
 پھر جتنے میں آنکھیں بھی کھلی رکھوں کیا یہ بھی ضروری ہے؟ مجھے آنکھیں تو بند کر لینے دو
 پھر شوق سے چھری چملاؤ۔“

وہ اس سے الگ ہو کر دیوار سے جا لگی۔

”جاؤ اشعر..... سب لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ وہاں دہن تم لوگوں کی منتظر ہو گی۔
 دہن کے دل کو کیسے کیسے دھڑکے ہوتے ہیں! میں جانتی ہوں۔ برا آہٹ پر کیسے گمان جاسکتے
 ہیں! مجھے سب پتا ہے۔ جاؤ اشعر!“

وہ مڑی تو کسری خالی تھا۔ اشعر نئی دہن کو پیانے جا چکا تھا۔



نجانے کتنے لمبے سر کے گھڑی کی سونیاں کتنی بار گھومیں۔ وہ بے جان ہے
 زکرت! ہسٹر پر پڑی دی پھر باہر بھٹی رات کو ہوش آیا! ہنگامے شور و غل گھر میں پھیل
 گیا۔

نئی دہلی گھر آئی تھی۔

تانیہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے روزِ حشر آ گیا ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

عورتیں دہلی کو سڑھیاں چڑھا کر اوپر کی منزل پر واقع کمرے میں لئے جا رہی تھیں۔ بلی کی آوازوں سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ کسی نے اس کو نہیں دیکھا کسی نے دیکھا بھی تو نظریں چرائیں۔

وہ یک نکل لال شرارے میں لیٹے وجود کو اوپر جاتا دیکھ رہی تھی۔

دس برس کا منظر یوں نظروں کے سامنے ایسے اکھڑا ہوا تھا جیسے کل کی بات ہو۔

سرخ اتاری موٹے کے کپڑوں میں ملیں: ہونٹوں پر شرمیلی مسکراہٹ سجائے وہ یونہی سڑھیاں ملے کرے اوپر کمرے میں چلی تھی۔

”تانیہ! یہ تم ہونا!“ اشعر مہبوت ہنسیا تھا۔ ”یہ رنگ روپ: یہ مسکراتا وجود واقعی میرا ہے۔“

اس کی چمکنی پگھلوں پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”آج سے میری ہر جان تم پر نونے کی جانی!“

اور وہ دونوں زور سے ہنس دیے تھے۔

تانیہ روتے روتے ہنس دی پھر چونک کر آنسو صاف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ خالی کمرہ اس کا دل چیرنے لگا دیواریں سنہ کو آٹے لگیں۔ پچھلے دس برسوں میں وہ کبھی اکیلی نہ رہی تھی۔ اشعر کہیں بھی ہوتا، کہیں بھی جاتا، رات کو ہر حال میں پلٹ آتا تھا۔ وہ کبھی اپنے منے میں رات نہ رکھتی تھی۔ اسے اپنے کمرے اور جیون سنا تھا۔ دلوں کے ہاتھ نہ آتی تھی۔

اور آج جدائی کی پہلی رات تھی۔

وہ تنہا بیٹھی سسک رہی تھی۔ منہ کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

”تانیہ!“ اس کے پیچھے آواز بھری تھی۔

اسے یوں لگا جیسے یہ اس کا دام ہوا، بھلا! اشعر اور اس وقت۔

وہ بچن کی سی تیزی سے چلی۔ اشعر اس کے پیچھے کھڑا تھا اس کے پسندیدہ لباس میں۔ سفید کمرہ شلوار اس پر کتنا بچتا تھا۔ وہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔

”تانیہ!“ اس نے تانیہ کے برف جیسے سرد ہاتھ تمام لیے۔

تانیہ نے اس کا ہاتھ چمڑے پر رکھ لیا۔

”اشعر..... تم یہاں کیوں آئے؟“

”بس ایک نظر تمہیں دیکھنے۔“

تانیہ سادگت کھڑی رہ گئی۔ وہ بس ایک نگاہ کی خیرات دینے آیا تھا۔ وقت کی

ساری دولت اب وہ کسی اور کے نام لگنے چکا تھا۔

”اشعر!“ اس کے بیٹوں پر بخروج مسکراہٹ پھیلی۔ ”کبھی ملکی تمہیں میری پسند۔“

”چم نہیں میں نے تو اب تک اس کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔“ وہ بے بسی سے

ہلا۔ ”میرے ذہن میں تو تہااری آنسوؤں سے بھری آنکھیں نہیں نکلتیں میں اسے کیا دیکھتا۔“

”اشعر..... اشعر۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اشعر نے مہربانی سانس بھر کر خود پر قابو پایا۔

”میں چلتا: دول تانیہ۔۔۔! وہ۔۔۔ میری منتظر ہے۔“

جانی کو یوں لگے جیسے تیز دھار خنجر کا پتکنا پھل اس کے سینے میں اترا ہے۔ اس کی

سانس اکھڑ گئی۔ وجود کھپانے لگا۔

”اشعر..... نہیں نہیں۔ مجھے تیرا ذکر مت جاؤ۔ ندا کا واسطہ تم میرے

پاس سے نہ جاؤ۔“

”تانیہ..... خود کو سننا لو۔“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”کتنا بچایا تھا میں نے تمہیں.....“

”ہاں! اشعر! بچایا تھا بہت سمجھایا تھا مگر میں پاگل ہو گئی تھی۔ میں..... میں

دیوانی بن گئی تھی۔ میں وہ کی دیوی بنا جانتی تھی۔ میں بھولی ہاں بنا جانتی تھی لیکن

اب اب میں کچھ نہیں جانتی۔ چہ نہیں۔ میں بس یہ رات جانتی ہوں۔ میں یہ رات

تمہارے ساتھ بنا جانتی ہوں۔ تمہاری دہن میں تم۔ اشعر زندگی کی ہر رات اس کے

نام کر دینا، بس آج رات مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا کا واسطہ، تمہیں میری محبت کا واسطہ۔“
بالکل دیوانی لگ رہی تھی۔ اشعر پریشان ہوا تھا۔

”تانیہ! کچھنے کی کوشش کرو لوگ کیا کہیں گے؟“

”تمہیں مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا ہے مجھ سے زیادہ۔ میں سچ کہتی ہوں، اگر تم
مکے تو میں۔۔۔ میں دوسب گھولیاں کھا لوں گی۔۔۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔“
اسے قرار آ گیا۔ اندر اٹھنے ایال بیٹھنے لگے۔ وہ بستر پر گر کر ہانپنے لگی۔

”اچھا میری بات سنو۔“ اشعر نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہال سیٹے۔ اس
کے کمرے میں خواتین میری منتظر ہیں، میں جاؤں گا تو وہ سب سونے کے لئے جائیں گی۔ تم
سمجھتی ہو؟ یہ بات۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھتا ہوں، جب تنہائی میرے آئے گی تو میں تمہاری
طبیعت خرابی کا بھانا کر کے یہاں آ جاؤں گا۔ صبح جلدی اس کے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ کم
از کم دنیا والوں کی زبان تو بند رہے گی۔“

”تم۔ آؤ گے نا؟“ دو بے یقین ہوئی۔

”میں ابھی آتا ہوں تانیہ! ناؤر ملیکس پلیز۔“

وہ اس کا کال سمجھتا کر باہر نکل گیا۔

قدیل کے کمرے میں فخرہ بھاگی اور بٹشے کی ایک اور بہن موجود تھیں۔ اس
کے جانے پر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔

وہ چند لمحوں کی کیفیت میں کمزار باہر بیڈ کے کنارے تک گیا۔

”قدیل!“ اس نے تذبذب سے پکارا تھا۔

”جی!“ نہایت خوبصورت سرخو آواز تھی۔ ”کہیے“ سمجھتے ہوئے اعصاب چونک

اٹھے تھے۔ اس نے دنگ اٹھائی۔

خوبصورت بے دماغ، مصدیت سے سچا چہرہ، رو رہا تھا۔ عروسی لباس میں وہ قدرت
کا شاہکار لگ رہی تھی۔ سرخ بندوں سے بھرے آئینے نے چہرے کو اپنے حصار میں لے
رکھا تھا۔ ماتھے پر چھایا ناک میں چمکتی ٹوئنگ اور نازک سی گردن سے لپٹا گلوبند سب کے
سب اس حسن بے دارغہ کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ بائیسویں کی جانب کھلتی کھڑکی سے ہوا

پانز م و ملائم جھوکا رات کی رانی کی مہک سیئے شرارت سے مسکراتا اندر چلا آیا۔ کمرے کی ہر جگہ مسکراہٹیں، اشعر بھی۔ قدین نے مسلسل خاموشی سے خمیرا کر نکال دیا تھا اور اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

اشعر نے ہاتھ برا کر اس کا گال دھیرے سے مچھوڑا وہ خود میں سمٹ گئی۔ وہ حسن بے مثال اس کا تھا، وہ حسین و جود اس کے نام لکھا چاچکا تھا۔ وہ اس کی دوسری میں تھی۔

گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں..... میں آتا ہوں قدیل! سونا مت۔“

وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔



دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو آس و نر اس کی کیفیات میں جھولتی تھی۔ کے مزہ دہوتے تن میں جان پڑ گئی۔

”اشعر!“ وہ دودھ کر اس تک گئی۔ وہ اسے لئے لئے بیڈ تک چلا آیا۔ دروازے کو لہروں کی شیشی نکال کر دو گولیاں نکالیں اور پانی کا گلاس بھرنے لگا۔

”تم تھک گئی ہو؟“ یہ! تمہیں نیند کی ضرورت ہے، تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ یہ اس نے گولیاں اس کی سمت بڑھائیں۔ وہ فوراً انہیں نکل گئی۔

”اب آرام سے سو جاؤ؟“ میں یہاں تمہارے پاس ہوں۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

چند منٹوں میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ اشعر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اس کے سونے کا یقین کیا اور جلدی سے اٹھ کر لائٹ بجھا دی پھر وہ بے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

اور اوپر جانے کی جلدی میں وہ سوئی ہوئی تانیہ کے سر بالے سے گولیوں کی شیشی اٹھا، بھیجی بیول گیا تھا۔

